ڈاکٹر جے ایم۔ ایس بالجن
ترجمہ
پروفیسر ولئی۔ ایس۔ طاہر علی

عُبیداللہ سندھی اور شاہ ولی اللہ کے قرآنی نظریات میں تقابُل

(سندھ پر عالمی مذاکرے میں ہالینڈ کے مشہور مستشرق ڈاکٹر بالجن نے انگریزی میں ایک مقالہ پڑھا جس کا یہ ترجمہ ہے۔)

عُبیداللہ سندھی (۱۸۷۲ء تا ۱۹۴۴ء) نہ تو سندھ میں پیدا ہوئے اور نہ ہی انھوں نے سندھ میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا۔ پھر بھی وہ خود کو "سندھی" لکھنا پسند کرتے تھے۔ ظاہر ہے اس کی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ اور اس کو سمجھنا ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ان کی پُرآشوب زندگی میں سندھ تین بار ان کے لیے جائے پناہ رہا اور گوشۂ عافیت ثابت ہوا۔ یہیں ان کو ذکر و فکر کے مواقع نصیب ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے شمالی پنجاب میں اپنے سکھ خانوادے کو خیرباد کہا اور پہلی دفعہ سندھ میں قدم رکھا۔ اسی سرزمین میں انھوں نے اسلام کے اصول و قوانین کا بغور مطالعہ کیا اور بھرچونڈی والے حافظ محمد صدیق کے مُرید ہو گئے۔ ایک قلیل مدت کے بعد وہ بھاول پور گئے اور ۱۸۸۹ء میں دارالعلوم دیوبند میں شاگرد کی حیثیت سے بھرتی ہوئے۔ دارالعلوم سے دستارِ فضیلت

حاصل کرنے کے بعد انھوں نے پھر سندھ کا رخ کیا اور بحیثیت معلم سندھ ہی کو اپنا مسکن قرار دیا۔ ۱۹۰۸ء میں ان کو پھر دیوبند جانا پڑا اور ۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنی جلاوطنی کے چوبیس سال کے اختتام پر تیسری بار پھر سندھ میں ورود کیا۔ اب کی دفعہ شاگردوں نے انھیں ایسا گھیرا کہ وہ یہیں رہے اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات پر مفصل خطبات دینے لگے۔

عُبید اللہ اپنے سیاسی کاموں کی وجہ سے بہ نسبت علمی کارناموں کے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی بیشتر کوششیں شاہ ولی اللہ کے بتائے ہوئے اصول اور اس پر عمل کرنے کے نتائج پر مرکوز تھیں۔ الہام الرحمٰن میں وہ شاہ ولی اللہ کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان معلوم ہوتے ہیں مگر اس میں ایک آدھ جگہ پر شاہ صاحب اور ان متبعین پر چوٹ کر گئے ہیں اور بتایا ہے کہ یہ حضرات صرف نظریاتی تھے اور نظریات کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ گرچہ ساتھ ہی ساتھ کشادہ دلی سے یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ شاید یہ لوگ حالات سے مجبور تھے۔

بے جا نہ ہوگا اگر ہم عُبید اللہ کے سندھ پر اثر و رُسوخ سے بحث کرتے ہوئے اُن کے علمی کارناموں پر بھی کچھ کہیں کیونکہ انھوں نے بالخصوص سندھ میں اپنی معلمانہ زندگی کا آغاز کیا تھا۔ میری رائے میں تو یہ بہت ضروری ہے۔ یہ بین الاقوامی مذاکرہ درحقیقت ان کی اس تنقید کا جواب ہے جو مذکورہ کتاب میں موجود ہے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمانانِ سندھ محمد بن قاسم کے نام پر فخر تو ضرور کرتے ہیں مگر اس نامور فرزند اسلام کے بارے میں ان کا علم صفر کے برابر ہے۔ جو کچھ تاریخی کام انھوں نے خود کیا وہ ان کی رائے میں ہندو اور انگریزوں کی معیت میں ہوا ہے۔ مسلمان تو اس بات میں بالکل کورے ہیں۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں نے اس موضوع کو کیوں پسند کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ۱۹۶۸ء میں جب میں حیدرآباد آیا تو میرے کرم فرما استاذ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے مجھے عبید اللہ سندھی کی دو کتابیں بطور ہدیہ دیں۔ یہ دونوں کتابیں قرآن پر لکھی ہوئی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ان کتابوں کی اس سے زیادہ اچھی

رسید کیا دوں کہ میں اپنے غائر مطالعہ کا خلاصہ اس مذاکرے میں پیش کروں جس کی شرکت کا شرف مجھ کو حاصل ہوا ہے۔

عُبید اللہ اور شاہ ولی اللہ کا قرآنی نظریات میں تقابل اس لیے برمحل ہے کہ عبید اللہ نے اپنی تفسیر میں شاہ صاحب کو دلیل راہ مانا ہے اور ان کو اپنے خیالات کا سرچشمہ گردانا ہے۔ اسی وجہ سے مجھے ترغیب ہوئی کہ میں معلوم کروں کہ ان دونوں حضرات میں کس حد تک ہم آہنگی ہے اور کہاں کہاں انھوں نے ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ سے گریز کیا ہے۔

عُبید اللہ قدم قدم شاہ ولی اللہ کا تتبع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے شاہ ولی اللہ کے محاورات اور اصطلاحات کو بے دریغ استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ حظیرۃ القدس، الملأ الاعلیٰ، الملأ السافل، التجلی الاعظم، النفس الرحمانی وغیرہ وغیرہ۔ سورۂ آل عمران کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں کہ الفرقان کے معنیٰ وہ قدسی صفت ہے جس سے متصف ہوکر ایک انسان حظیرۃ القدس کی باتوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ یہ تطابق ہمیں اور بھی کلی طور پر نظر آتا ہے جب ہم سورہ البقرہ کی ۳۴ ویں آیت[۱] کو ان کی تفسیر میں پڑھتے ہیں۔ عُبید اللہ کہتے ہیں کہ خدا نے یہ حکم اس لیے دیا تھا کہ فرشتے سمجھ لیں کہ آدم اور ان کی اولاد کے لیے جو کچھ وہ کریں گے حق تعالیٰ کی عبادت میں شمار کیا جائے گا اور آدم اور اُن کی اولاد فرشتوں کی عبادت کے لیے قبلہ ثابت ہوں گے۔ شاہ صاحب نے بھی تاویلُ الاحادیث میں لکھا ہے کہ درحقیقت فرشتوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت مقصود تھی لہٰذا انھوں نے آدمؑ اور ان کی اولاد کا توسل اختیار کیا چنانچہ وہ فرشتوں کے لیے قبلہ ثابت ہوئے۔ آگے چل کر عبید اللہ ایک اور ثبوت "وفاداری بشرطِ استواری" بہم پہنچاتے ہیں اور مسئلہ تطبیق پر زور دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ قرآنی آیات کا ایک دوسرے سے باقاعدہ ربط ہے۔ شاہ صاحب بھی تفہیماتِ الٰہیہ (۱۔ ۴۷) میں لکھتے ہیں کہ اعتقاد درست رکھنے

---

۱ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (ترجمہ) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو۔

کا ایک لازمی طریقہ یہ ہے کہ ہر انسان قرآن خود پڑھے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔ ان کی یہ آرزو ہمیشہ رہی کہ اساتذہ اپنے شاگردوں کو بار بار تلقین کرتے رہیں کہ قرآن کو بغیر ترجمہ یا تفسیر پڑھا جائے۔

ان دونوں حضرات نے جہاد پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ سورۃ البقرہ کی ۳۰ویں آیت کی تفسیر کرتے ہوئے عبیداللہ کہتے ہیں کہ فرشتے یہ بات ہرگز نہ کہتے اگر انھیں معلوم ہوتا کہ سلطنت کی بنیاد قرآن پر رکھنے سے جنگ و جدال ایک لازمی شئے ہو جاتی ہے۔ سورۃ النساء کی ۱۰۴ویں آیت[۱] کے متعلق رقمطراز ہیں کہ اگر ایک ہی وقت میں جہاد کا حکم ہو اور نماز کا بھی تو جہاد کے حکم کو نماز کے حکم پر ترجیح دی جائے گی۔ شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے ایک خطبے میں مسلمان بادشاہوں سے خطاب کرکے کہا ہے کہ

"ہمارے زمانے کے الملأ الاعلیٰ کا یہ پیغام ہے کہ تم اپنی تلواروں کو نیام سے باہر نکالو اور ان کو نیام میں نہ رکھو جب تک کہ مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان حد فاصل قائم نہ ہو جائے۔"

سورۃ النساء کی ۶۴ویں آیت[۲] کی تفسیر کرتے ہوئے عبیداللہ لکھتے ہیں کہ مفسرین کی یہ غلطی ہے کہ وہ منافقین کے اسباب و مواقع کو مکہ اور مدینہ کی تاریخ میں ڈھونڈتے ہیں۔ اس سے تو یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حقیقت میں صرف عربوں کے لیے نازل ہوا تھا۔ یہی انداز فکر شاہ ولی اللہ کا ہے۔ انھوں نے الفوز الکبیر (صفحہ ۲۱) میں اسباب نزول کی اہمیت پر زور دینے والوں کو تنبیہ کی ہے۔ ان دونوں حضرات کا خیال تھا کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا از بس ضروری ہے کہ انبیاء کرامؑ پر جو آیات نازل ہوئیں وہ اُن کے وقت اور حالات کے مطابق تھیں۔

---

[۱] فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ جب تم مطمئن ہو جاؤ تو نماز ادا کرو۔

[۲] رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا۔ تم دیکھتے ہو کہ منافقین تمھارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔

اسی طرح عبید اللہ نے سورۂ آل عمران کی ۹۱ ویں آیت[51] کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ مقام ابراہیمؑ اور حجرِ اسود پرانے زمانے کی عبادت کی نشانیاں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے زمانے کے دستور کے مطابق سنگِ اسود کو ایک مخصوص مقام پر اس لیے رکھا تاکہ انھیں معلوم ہو کہ کون کون شخص اس کو چھوتا ہے اور ان کے عہد و پیمان میں شریک ہے۔ تفہیماتِ الٰہیہ (جلد ۲ صفحہ ۶۶) میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ حقیقت وہی ہے جو اپنے زمانے سے مطابقت رکھتی ہو۔ قرآن کی یہی امتیازی خصوصیت ہے کہ اس کا نزول حالات کے مطابق ہوا ہے۔ الفوز الکبیر میں وہ لکھتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات کا ڈھانچہ قدیم عربوں کے طرزِ تحریر کے مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی قوانین میں نہ تو فقیہوں والا اختصار ہے اور نہ وہ شرائط لگائے گئے ہیں جو موشگافی اور پیش بندی کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ چند امور میں عام حالات کا جاننا بے حد ضروری ہوتا ہے اور ان پر مبسوط تبصرے موجود ہیں مگر ان میں منطقی دلائل نہیں ہیں اور بعد میں آنے والے مضمون کے ساتھ ربط نہیں رکھا گیا ہے۔ اس قسم کا طرز علمائے متاخرین میں پایا جاتا ہے۔ اسی کتاب میں کوئی تیس صفحوں کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ قرآن میں ایسی تطبیق قابلِ اعتنا نہیں سمجھی گئی۔ ایک ہی وقت میں نازل شدہ آیات الگ الگ مقامات پر بعض وقت بیان کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ البقرہ کی ۱۳۹ ویں آیت[52] کو دیکھیے۔ یقیناً یہ آیت[53] نمبر ۱۳۶ سے قبل نازل ہوئی ہوگی۔ قرآن کا کام ہدایت کی تلقین کرنا ہے، وہ کہ اپنے پیغام کے تمام پہلوؤں کا تسلسل قائم رکھنا۔ جب آیتیں بار بار دہرائی جاتی ہیں تو وہاں "استحضار" مقصود ہوتا ہے۔

---

[51] فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ۔

[52] قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا۔ ہم دیکھتے ہیں تم کو اکثر آسمان کی طرف اپنا منہ کیے ہوئے لہٰذا تم کو ہم ایسے قبلہ کی طرف موڑیں گے جو تمھیں پسند آئے گا۔

[53] سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا۔ بے وقوف لوگ کہیں گے کہ کس وجہ سے انھوں نے اپنے قبلہ سے منہ موڑ لیا جس کے وہ عادی تھے۔

جس کا مفہوم مخاطب الیہ کے ذہن میں بات کو پیوست کرنا ہے۔ ایسا کرنے سے سامعین قرآن کی تعلیمات کو بخوبی سمجھنے لگتے ہیں اور ان کے دلوں میں اور دماغوں میں وہی لذت اور سُرور پیدا ہوتے ہیں جو نظم کو ایک بار پڑھنے کے بعد پھر سے دُہرانے پر ہوتے ہیں۔

قرآن کے اس تاریخی مناظر کا انکشاف عبید اللہ کے بلند پایہ عالم ہونے کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ سورۂ یوسفؑ کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ خُدا نے محمد المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورہ میں آگاہ کیا ہے کہ آپ پر بھی ایسی اُفتاد آنے والی ہے۔ چنانچہ اس میں ان تمام باتوں کا ذکر ہے جو قریش کے ہاتھوں ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کو سہنے پڑے۔

پیغمبروں کے خرق عادات پر دونوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ گرچہ ہر ایک نے اپنا اپنا طرز عمل اور انداز بیان اختیار کیا ہے۔ عبید اللہ کی رائے میں شریعت کے احکام عقل کے درک سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے پیغمبر کو ایسی بات کرنی پڑتی ہے جو خرق عادت تصور ہو اور ان کے مشن کی کامیابی میں ممد و معاون ثابت ہو۔ کچھ پیغمبر ایسے بھی آئے ہیں جو صاحب شریعت نہیں تھے مثلاً ہودؑ۔ انھیں خرقِ عادت سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ عقل سلیم ان کی باتوں کو مان لیتی تھی۔ سورۂ ہودؑ میں ارشاد ہوا ہے[۵] "اے ہود! آپ نے کوئی معجزہ نہ دکھایا"۔

شاہ صاحب بھی ان خرق عادت والے کارناموں کی افادیت کو ایک تشبیہ کے طور پر یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ اللہ نے اپنے گمراہ بندوں کی ہدایت کے لیے اپنے پیغمبر بھیجے جو دانائی اور پند و نصیحت سے اللہ کے بندوں کو مطمئن کرتے ہیں اور راہِ راست پر لگاتے ہیں۔ اس کو دُوسری مثال سے یوں کہہ دیجیے کہ ایک مالک نے اپنے بیمار نوکروں کے علاج کے لیے ایک بھروسے والا معالج مقرر کیا جو بیماروں کو سمجھاتا ہے کہ اس کا علاج نہایت آسان ہے اور اس سے فوری نجات حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ بیمار اس کا کہنا مان لیتے ہیں اور

۵۔ یٰهُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ۔

اپنے معالج کے ہاتھوں بالکل اطمینان سے علاج کرا لیتے ہیں۔

عُبیداللہ کی تفسیر میں زیادہ تر سیاسی پہلو نظر آتا ہے۔ انھوں نے "الہام الرحمٰن" کی دُوسری جلد کے ابتدائی حصہ میں لکھا ہے کہ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ نظام عالم کی بنیاد دینِ ابراہیم پر رکھی جاسکتی ہے۔ یہودیت اور عیسائیت سے یہ کام انجام نہیں پاسکتا۔ مزید برآں وہ کہتے ہیں کہ قرآن کے احکام کی خلاف ورزی غلامی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ توراۃ اور انجیل کے نازل ہونے کا مقصد بھی یہی تھا۔ لیکن موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے ماننے والے بے بس اور کم مایہ لوگ تھے۔ چنانچہ انھیں یہ مقصد حاصل نہ ہوا۔ اس کے برعکس محمد المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بلند حوصلہ اور باصلاحیت تھے۔ اور اَن پڑھ تھے۔ لہٰذا مخالفت کا سوال ہی پیدا نہ ہوا اور کامیابی نے ان کے قدم چُومے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی پرستش کی اور یہی سبب منتج ہوا کہ وہ اپنے بادشاہوں کی بھی پرستش کریں۔ پھر نظام عالم کی فلاح و بہبود کا سُوال ہی نہ رہا۔ عبیداللہ کے نزدیک اہل ثروت اور شخصی آمریت والے لوگ انسانی معاشرہ کو تتّر بتّر کردیتے ہیں۔ شاہ صاحب نے بھی اس پر کافی زور دیا ہے۔ اسی کتاب میں اس سے آگے کے ساٹھ صفحوں کے بعد عبیداللہ حُجۃ اللہ البالغہ کی افادیت کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب میں تمام قسم کی مُلوکیت کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

میرے خیال میں عبیداللہ نہ صرف ملوکیت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں بلکہ وہ سرتاسر اشتراکیت سے متاثر لگتے ہیں۔ مگر ان سب باتوں کو شاہ ولی اللہ پر تھوپنا دُرست نہیں ہے۔ آج کل کے مصنفین بشمولیت عبیداللہ، شاہ ولی اللہ کو اجتماعی اور سیاسی انقلاب کا تمام تر ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ یہ صرف مبالغہ اور غلو ہے۔ شاہ صاحب کی تصنیفات کو کھنگالیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اجتماعی اور سیاسی باتیں کم ہی ہیں مگر ان کو پڑھنے کے بعد جو تاثر ملتا ہے وہ بہت زوردار ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ کے پہلے حصہ میں انھوں نے نہایت واشگاف لفظوں میں کہا ہے کہ ایران اور رُوما کے شہنشاہوں کا سامانِ تعیش غریب عوام کے کندھوں پر ایک بھاری بوجھ تھا۔ ان کے افسران کاشت کاروں اور

تاجروں پر بڑے بڑے ٹیکس لگانے پر مجبور تھے اور رعایا مظلوم جانوروں کی سی زندگی گزارتی تھی۔ اسی کتاب کے دوسرے حصہ میں ایک اور عبارت آتی ہے جو بہت کم شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہے لیکن اسمیں اشتراکیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے:۔

"جائداد کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی کاشت کار کسی قطعۂ اراضی پر کاشت کرے تو وہ اس پر اپنا حق زیادہ ثابت کرسکتا ہے بہ نسبت اپنے غیر کے"۔

شاہ ولی اللہ کے کارنامے تشنہ رہ جاتے ہیں اگر ہم ان کے فارسی ترجمۂ قرآن کا ذکر چھوڑ دیں۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ مسلمانوں میں قرآن کا ترجمہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لیکن شاہ ولی اللہ نے قرآن کا ترجمہ کرنا ضروری سمجھا۔ وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت عربی زبان سے ناآشنا تھی۔

اس معاملے میں عبیداللہ دو قدم اور آگے معلوم ہو رہے ہیں۔ سورۂ النساء کی ۴۳ویں آیت[۵] کی تفسیر میں وہ فرماتے ہیں کہ اگر بغیر سمجھے بوجھے قرآن مجید پڑھے تو یہ بھی نشہ ہی ہوا۔ اس کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ نماز میں بھی ترجمہ پڑھے تاکہ اُسے معلوم ہو کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔

اسی طرح حوا کی پیدائش کے بارے میں دونوں ہم نوا معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھیے "تاویل الاحادیث" اور "خلاصۃ القرآن"۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ بہشت میں بھی آدم علیہ السلام میں شہوانی خاصیت موجود تھی۔ اسی بنا پر انھیں اپنے ہم جنس عورت کی جستجو رہی۔ اسی شہوت کے غلبہ نے آدم کے ذہن میں عورت کا تصور قائم کیا اور عورت وجود میں آئی۔ عبیداللہ بھی اپنی تفسیر میں کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں لیکن اسی پر

۵؎ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔

اے مؤمنو! نماز کے قریب نہ آؤ۔ جب تم نشہ میں ہو۔ یہ پابندی اس وقت تک ہے کہ تم جو کچھ کہتے ہو اسے سمجھنے لگو۔

اکتفا نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں قرآن میں حوا کی آدم سے پیدائش کا قصہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ معمولی سے معمولی آدمی بھی انسانی پیشوا کا تصور آسانی سے سمجھ لے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ حوا آدم کی سگی بہن تھی کیونکہ وہ بھی نوع انسانی کے "اما" کی بیٹی تھی۔ جیساکہ سورۂ النساء کی پہلی آیت میں ذکر آیا ہے کہ ایک ہی نفس سے تم پیدا ہوئے ہو۔[۵۱]

ہم نے اب تک شاہ ولی اللہ اور عبیداللہ کی ہم آہنگی کا ذکر کیا ہے۔ اب ہم ان دونوں میں مختلف فیہ خیالات کا ذکر کریں گے۔

ہندو مذہب کے متعلق دونوں کی رایوں میں اختلاف ہے۔ شاہ ولی اللہ ہندوؤں کو مشرک سمجھتے ہیں۔ لیکن عبیداللہ کا رویہ اس بارے میں نرم ہے۔ وہ سورۂ البقرہ کی ۵۹ ویں آیت[۵۲] میں صابئین کو تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں:۔ (۱) مجوسی (۲) برہمن اور (۳) بدھ مت والے۔ سورۂ جن کی پہلی آیت[۵۳] کی تفسیر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی تبلیغ کا مرکز حضرت ابراہیمؑ کی مرزبوم تھی۔ اس کے باہر قوم جن کی قلمرو ہے جو درمیان میں واقع ہے اور وہاں سے قرآن کا پیغام ان لوگوں تک پہنچتا ہے جو مرتاض ہیں اور دُنیا و مافیہا سے کنارہ کش ہو گئے ہیں مثلاً راہبوں کا یا سادھوؤں کا گروہ اور گوتم بدھ کے مسلک پر چلنے والے لوگ۔

ہندوؤں کے بارے میں اجتماعی خیالات کا سُراغ عبیداللہ نے سورۂ النساء کی ۳۶ ویں آیت[۵۴] سے لگایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں زکوٰۃ حاصل کرنے والے یتیم اور حاجتمند رشتے دار ہو سکتے ہیں۔ لیکن نزدیک والا اور دُور والا پڑوسی کے الفاظ اس بات کی غمازی

---

۵۱ یَاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

۵۲ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا۔

۵۳ اِسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ۔ ۵۴ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْــٴًـا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ۔

کرتے ہیں کہ غیر قوم والوں سے بھی یہ سلوک روا ہے۔ حکیم اجمل خان نے اس ضمن میں بہت اچھی مثال قائم کی ہے۔ ان کا فیض سب کے لیے عام ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو یا سکھ۔ شاہ صاحب نے کسی وجہ سے مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ یہ یکساں سلوک روا نہیں سمجھا۔ التفہیمات الالٰہیہ (جلد ۲ صفحہ ۲۴۵) میں وہ فرماتے ہیں کہ انھیں عربی النسل ہونے پر اور عربی زبان جاننے پر فخر ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں محمد المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب حاصل کرنے کا باعث ہو سکتی ہیں۔ پھر الخیر الکثیر (خزانہ ۹) میں رقمطراز ہیں کہ غیر عربوں کے کمالات مجازی ہیں۔ لیکن عبیداللہ کے ہاں عجمی ہونے کا احساس کمتری مطلق نہیں پایا جاتا۔ ان کی رائے میں عربوں کے زمانۂ عروج میں بھی مذہبی امور کے نامور فضلاء عجمی لوگ تھے۔ اپنی تفسیر میں انھوں نے اپنے ہندی نژاد ہونے پر فخر کیا ہے۔ اور آدمؑ کی بہشت کو کشمیر میں بتایا ہے۔

علاوہ ازیں اور بھی مختلف فیہ باتیں ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کی اس آیت[1] کے ترجمہ پر غور کیجیے۔ "جب میں نے تجھ کو (عیسیٰؑ کو) روح القدس کی تائید دی" شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جبریل نے مریم کی شرمگاہ پر دم کیا۔ لیکن عبیداللہ اسے "فرقان" کے مترادف سمجھتے ہیں جو سورۂ آل عمران کی دوسری آیت[2] میں مذکور ہے اور جس کا مفہوم حظیرۃ القدس سے قریبی تعلق پیدا کرنا ہے۔

غرضیکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عبیداللہ اپنے محترم پیشوا کے نقش قدم پر عام طور سے چلتے نظر آتے ہیں لیکن ان میں اندھی تقلید نہیں ہے۔ بعض اوقات وہ اپنی رائے پر قائم رہتے ہیں اور بوقت ضرورت ایک جداگانہ طریقہ بھی اختیار کرتے ہیں۔

---

[1] اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۔ (سورۃ المائدہ)

[2] وَاَنْزَلَ التَّوْرٰاۃَ وَالْاِنْجِیْلَ مِنْ قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۔